نامی انصاری

بیسویں صدی میں طنز و مزاح

اردو میں طنز و مزاح کے بکھرے ہوئے نقوش اگر چہ اٹھار ہویں اور انیسویں صدی کی نظم و نثر میں مل جاتے ہیں، مثلاً سوداؔ کے قصائد شہر آشوب، غالب کے بعض خطوط اور غزلوں میں رند و محتسب سے چھیڑ چھاڑ کے نمونے، لیکن طنز و مزاح کا ایک منظم دور ۱۸۷۷ء میں لکھنو میں اودھ پنچ "کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ منشی سجاد حسین نے یہ ہفتہ وار اخبار، لندن پنچ کے طرز پر جاری کیا تھا اور اس میں صرف مزاحیہ نظم و نثر ہی کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ اخبار اپنے پہلے دور میں ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ اس کا دوسرا دور ۱۹۱۶ء سے شروع ہوا اور ۱۹۳۴ء میں یہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ اودھ پنچ کے اصل کارنامے اس کے پہلے ہی دور میں وجود میں آئے اور طنزیہ و مزاحیہ نظم و نثر لکھنے والوں کا ایک خاصہ بڑا حلقہ اودھ پنچ کی معاونین میں شامل ہو گیا۔ ان میں منشی سجاد حسین رتن ناتھ سرشار، سید محمد آزاد ،اور اکبر الہ آبادی کے ساتھ ساتھ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوق، سرشار کسمنڈوی، تربھونی ناتھ ہجرؔ، عبدالغفور شہباز اور منشی جوالا پرشاد برقؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سرشار بعد میں منشی نولکشور کے اخبار "اودھ اخبار" سے منسلک ہو گئے۔ ان کا دیوزاد کارنامہ "فسانۂ آزاد" اپنے مزاحیہ اسلوب اور لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کی دلچسپ رقع نگاری کے باعث منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ فسانۂ آزاد کا بے مثل مزاحیہ کردار "خوجی" آج بھی اردو ادب کے تمام مزاحیہ کرداروں میں سر فہرست ہے۔

اودھ پنچ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے طنز و مزاح کے مشرقی حربوں، ہجویات اور تحریفات سے آگے بڑھ کر، اردو میں مغربی طرز کے طنز و مزاح کو رواج دینے کی کامیاب

کوشش کی۔ "اپنی پالیسیوں میں یہ انگریزی حکومت کا سخت مخالف، کانگریس کا طرفدار، سر سید اور ان کی تحریک کا دشمن، قومی یک جہتی کا حامی، امن و آشتی کا پیغامبر اور طنز و مزاح کا شاہکار تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا بیباک صحیفہ تھا جس نے انگریزی حکومت کے دبدبے کا لحاظ نہ کرتے ہوئے، بیباکانہ سیاسی تحریک کی بنیاد ڈالی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لئے آواز اٹھائی۔"

(معاونین اودھ پنچ۔ صفحہ ۱۲)

بیسویں صدی کے نصف اوّل کے مزاح نگار شعراء میں اگر اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ تا ۱۹۲۱ء) کو سر خیل شعرائے مزاح نگار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ سر سید کی رحلت کے بعد اگرچہ انکا خصوصی ٹارگٹ جاتا رہا لیکن مغربی تہذیب نے جس تیز رفتاری سے ہمارے آدابِ زندگی، تہذیب و تمدن اور رسوم و رواج پر قبضہ جمانا شروع کر دیا تھا، اس کے تعلق سے سیکڑوں موضوعات و مسائل ایسے تھے، جن کو اکبر نے اپنے ظریفانہ کلام سے تختۂ مشق بنایا اور مغربیت کی بڑھتی ہوئی آندھی کے خلاف ایک مضبوط دیوار بنانے کی کوشش کی۔

اکبر کی شاعری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ طنز و مزاح کے سبھی حربے ان کی دسترس میں تھے اور وہ ان کا بڑا ہنر مندانہ استعمال کرنے پر قادر تھے۔ وہ صرف لفظوں کے الٹ پھیر یا انگریزی الفاظ کے بر محل استعمال سے ہی ظرافت نہیں پیدا کرتے بلکہ خیال، واقعہ اور معنی کی ظرافت بھی ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انہوں نے متعدد تمثیلی کردار بھی وضع کئے ہیں اور ان کے سہارے، اپنے طنز کو زیادہ کارگر بنایا ہے۔ اکبر کا فنی کمال یہ ہے کہ اردو کے ذخیرہ الفاظ پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے اور ان کا ذہن بہت دراک اور سریع الحس ہے۔ شبلی کے لئے "قبلہ قبلی" اور "سن کی سی" کے لئے "مولوی مدن کی سی" کا قافیہ صرف اکبر ہی کو سوجھ سکتا تھا۔

کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ "اکبر کا آرٹ ریزہ خیالی کا آرٹ ہے۔ اس میں وسعت اور پیچیدگی نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ وہ مفرد اشعار، رباعیات اور مختصر قطعات پر انحصار کرتے ہیں، اور بڑی اور طویل نظمیں لکھنے سے کتراتے ہیں۔" (طنز و مزاح۔ تاریخ تنقید۔ صفحہ ۳۸) لیکن یہ محض جزوی سچائی ہے۔ اکبر کے ظریفانہ کلام کا بیشتر حصہ اگر چہ مفرد اشعار، رباعیات اور مختصر قطعات ہی پر مشتمل ہے لیکن انہوں نے بہت سی طویل مزاحیہ نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں ان کی شاہکار نظم "جلوۂ دربار دہلی" بھی شامل ہے۔ "مدرسۂ علی گڑھ مستقبل" اور وہ طویل قطعات جس میں کوئی واقعہ یا کہانی بیان کی گئی ہے، یہ نہیں ثابت کرتے کہ اکبر کو نظم نگاری کا ملکہ نہیں حاصل تھا۔ ان کا مقصد مزاحیہ شاعری میں اپنا فنی کمال ظاہر کرنا نہیں تھا بلکہ ہنسی ہنسی میں مغربیت کے امنڈتے ہوئے سیلاب کے خلاف اپنے ہم وطنوں کا ذہن تیار کرنا تھا۔ اکبر کا کلام نہ صرف لطف انگیز اور تحیر خیز ہے بلکہ آج کے زمانے سے اس کا کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود، یہ ہمیں مسرت اور بصیرت عطا کرتا ہے۔ اس میں جو شوخی اور سرخوشی ہے، جو برجستگی اور چٹپٹا پن ہے، جو تازگی اور شگفتگی ہے، وہ آج بھی پڑھنے والوں کو باندھ رکھنے کی قوت رکھتی ہے۔

اکبر کے تتبع میں یا ان سے متاثر ہو کر، اقبال نے بھی اپنے ابتدائی دور میں کچھ مزاحیہ اشعار موزوں کئے جو ان کی پہلی کتاب "بانگِ درا" میں ظریفانہ عنوان کے تحت شائع ہوئے ہیں۔ ان اشعار کی کل تعداد ۹۶ ہے اور یہ قطعات کی صورت میں ہیں۔ اچھا ہوا کہ اقبال نے اپنے مزاحیہ قطعات کو شائع کر دیا ورنہ عین ممکن تھا کہ زمانے کی الٹ پھیر سے یہ اشعار بھی کسی وقت کلیات اکبر میں شامل ہو جاتے اور بالکل بے جوڑ نہ معلوم ہوتے۔ شبلی نعمانی نے بھی کچھ نظمیں طنزیہ انداز میں لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ اکبر، اقبال، اور شبلی کے بعد اس دور میں ظریف لکھنوی اور احمق پھپھوندوی کا ظریفانہ کلام قابلِ ذکر ہے۔ ظریف نے الیکشن کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے۔ اس میں چند علامتی کرداروں کے ذریعے انہوں نے

الیکشن کے سماجی اور سیاسی پہلوؤں کی مضحکہ خیزیوں کو بڑی خوبی سے ابھارا ہے۔ احمق کے مزاحیہ کلام میں شوخی اور ظرافت کے عناصر کافی ہیں لیکن مجموعی طور سے ان کے کلام میں اعلاادبی ظرافت کی کمی نظر آتی ہے۔ان کے موضوعات میں سیاست، مذہب اور معاشرت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

اس دور کے ممتاز نثر نگاروں میں میر محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش، خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی، قاضی عبد الغفار، ملاّ رموزی، عبد الماجد دریابادی اور ابوالکلام آزاد کے نام سامنے آتے ہیں لیکن ان میں کوئی ادیب کلّی طور سے مزاح نگار نہیں ہے بلکہ بعض مواقع پر انہوں نے کہیں طنز، کہیں مزاح اور کہیں ان دونوں کے امتزاج سے اپنی تحریروں کو دو آتشہ بنایا ہے۔

محفوظ علی بدایونی کی تحریروں میں گھریلو زندگی کے پس منظر میں تصورات کے نئے زاویے ملتے ہیں شیخ سماءاللہ کی صاجزادیاں،ان کا مشہور مضمون ہے۔

آسیہ۔(روپا بیگم کو دعائیں دیتے ہوئے)"جیتی رہو۔سدا سہاگن رہو۔دعا دینے کو تھی کہ دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلوں مگر درخواست سے پہلے ہی منظوری کا اثر دیکھ رہی ہوں۔ خود نہانا تو کوئی بات نہیں،تم تو دودھ سے دوسروں تک کو نہلا رہی ہو۔

مہدی افادی فطرتاً بڑی شوخ اور رنگین طبیعت کے مالک تھے۔ عورت ان کا خاص موضوع ہے اور خوش مذاقی ان کا خاص وصف۔انکی تحریروں میں انہی دونوں کے کرشمے ملتے ہیں۔خواجہ حسن نظامی چھوٹے چھوٹے فقرے لکھتے ہیں،رعایت لفظی پر زیادہ تکیہ کرتے ہیں اور شعری صفت گری سے نثر میں بھی کام لیتے ہیں۔وہ زندگی کی معمولی معمولی چیزوں پر گہری نگاہ ڈالتے ہیں اور شوخی و ظرافت کے نئے نئے پہلو بر آمد کرتے ہیں سلطان حیدر جوش کے یہاں طنز کارکاری ہوتا ہے مگر مزاح سے خالی ہونے کے باعث اکثر زہر خند تک پہنچ جاتا ہے۔ان کے بارے میں یہ عام خیال ہے کہ انہوں نے مغربی طنز کو اصل لہجے میں اردو

میں کامیابی سے برتا ہے۔ اس ضمن میں ان کا موازنہ نواب سید محمد آزاد سے کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے موضوعات اور اسلوب میں کافی مماثلت ہے۔

ملّا رموزی اپنی گلابی اردو کے لئے مشہور ہیں۔ یہ ایک جدت ضرور تھی مگر افادیت اور امکانات سے خالی تھی اس لئے ابھی تک سمٹ کر رہ گئی۔ ان کے ہمعصروں میں سجاد علی انصاری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ انکی تحریروں میں ایک چونکا دینے والا تیکھا پن اور ایک حیرت خیز فلسفیانہ زوایۂ فکر ملتا ہے جس میں دلچسپی اور ذہنی تفریح کے ساتھ ساتھ غور و فکر کی بھی ترغیب ہوتی ہے۔ مثلاً:۔

"سعیِ ناکام" دعائے مقبول سے برگزیدہ تر ہے۔ کوششوں میں عظمتِ انسانی مضمر ہے لیکن دعا، انسانیت کا اعلان شکست ہے، جس کے ذریعے انسانی مجبوریوں کا راز، ان فرشتوں پر بھی منکشف ہو جاتا ہے جو کسی طرح اس انکشاف کے اہل ہیں۔" (دعا)

قاضی عبد الغفار نے لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری سے اردو ادب میں اپنی مستقل جگہ بنا لی ہے ان کے طنز میں سماج کے تئیں ایک نئی بیداری کے عناصر ملتے ہیں۔ اپنے موضوع اور اسلوب پر ان کی گرفت قابلِ رشک ہے۔ لیلیٰ۔ اپنے ایک عاشق سے کہتی ہے:۔

"ایک شب، دو شب، ہزار شب، جتنا روپیہ صرف کر سکو، میرے مہمان رہو، پھر جب تھک جاؤ تو گھر جا کر کسی شریف خاندان میں کسی نیک بخت کو اپنی شریک حیات بنا کر اور سیدھے حج کرنے چلے جاؤ۔"

لیلیٰ کے ان دو جملوں میں بیسویں صدی کے دورِ اوّل کے مسلم سماج کی ایک منہ بولتی تصویر اتر آئی ہے۔ اودھ پنچ اور جدید نثر کے بیچ کا عبوری دور، مولانا ابو الکلام آزاد کے ذکر کے بغیر تشنہ رہ جائے گا۔ وہ عربی فارسی کے متبحر عالم، فلسفی، مفکر اور ایک بڑے سیاسی رہنما تھے لیکن صحافی کی حیثیت سے انہوں نے 'الہلال' میں جو فکاہیہ کالم لکھے ہیں ان میں بھرپور طنز موجود ہے جو بیشتر سیاسی ہے لیکن کہیں کہیں اس کے ڈانڈے آفاقی سچائیوں سے بھی مل جاتے ہیں۔ ایک اقتباس:۔

اگر اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی تاریکی، بت پرستی تھی تو اس کی جگہ آج ہر طرف نفس پرستی چھا گئی ہے۔ پہلے انسان پتھر کے بتوں کو پوجتا تھا۔ اب خود اپنے تئیں پوجتا ہے۔ خدا کی پرستش اس وقت بھی نہیں تھی اور اس کے پوجنے والے آج بھی نہیں ہیں۔"

"غبارِ خاطر" میں باورچی کی سرگزشت، چڑیا چڑے کی کہانی اور چائے نوشی کے بیان میں کہیں ظرافت اور کہیں طنز کے عمدہ نمونے مل جاتے ہیں۔۔۔؟ اور البلاغ کے طنزیہ شذرات کے مقابلے میں غبارِ خاطر میں ان کا اسلوب زیادہ شوخ اور توانا اور طنز کی کاٹ زیادہ مؤثر اور جاندار ہے۔

اس دور کی طنزیہ و مزاحیہ ادب میں، خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں، مشرقی روایات اور اندازِ فکر کا غلبہ ہے۔ غیر ملکی سیاسی نظام سے پیدا ہونے والی ناہمواریوں نے ہمارے سبھی مزاح نگاروں کو الجھائے رکھا اور ان کو دور تک دیکھنے اور سمجھنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ سیاسی و تمدنی ادارے ہوں یا ناہموار سماجی زندگی کے مناظر، ان سب پر ایک طرح سے قدامت اور اصلاح پسندی کا عنصر غالب تھا، اس لئے اس دور کا مزاحیہ ادب، تاریخ کا ایک حصہ تو بن گیا مگر جستہ جستہ مثالوں کو چھوڑ کر، اس میں وہ ژرف نگاہی، وسعتِ فکر پیچیدگی اور گہرائی نہیں ملتی جو ایک زندہ اور توانا ادب کا خاصہ ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس دور کا طنزیہ و مزاحیہ ادب اب صرف تاریخی حوالوں کے کام آتا ہے، اردو کے عام قاری کو اس میں دلچسپی کا سامان بہت کم ملتا ہے۔ اب تو اس دور کی کتابیں بھی مشکل سے ملتی ہیں۔

اردو نثر کے دورِ جدید میں فکری سطح پر کئی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ مغربی طرزِ فکر کے عام ہونے اور نئے سماجی شعور نے ادیبوں کو واضح طور سے متاثر کیا۔ انہوں نے نہ صرف اظہار کے نئے اطوار سے آشنائی حاصل کی بلکہ مواد کی پیش کش میں بھی اپنا انفرادی اسلوب بنانے کی شعوری کوشش کی۔ اس نئے دور میں طنز و مزاح کے موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلیاں آئیں اور اب ان کا ٹارگٹ فقط انگریز ہی نہیں رہ گیا بلکہ ارد گرد پھیلی ہوئی سماجی

ناہمواریاں اور بے اعتدالیاں بھی ان کے موضوعات میں زیادہ شدت سے شامل ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے مزاح نگاروں کا ایک ایسا گروپ سامنے آیا جس نے پہلے کے مقابلے میں زیادہ معیاری اور توانا فکاہیہ ادب تخلیق کیا اور اپنے دیرپا اثرات چھوڑے اس گروپ میں سب سے اہم نام مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۳ تا ۱۹۴۷ء) ان کا شاہکار "نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ ان کی کچھ میری زبانی" (مطبوعہ جولائی ۱۹۲۷ء) ہے جو خاکہ نگاری کا ایک نادر نمونہ اور عقیدت و حقیقت کا ایک خوشگوار مرقع ہے۔ اس میں ان کا ظریفانہ اسلوب۔ ان کے مخصوص ٹکسالی محاوروں اور فقروں سے مزین اور احترام کے ساتھ خاکہ اڑانے کے ایک جاندار سلیقے کا ایسا نادر نمونہ موجود ہے جس کی تقلید پھر کسی اور سے نہ بن پڑی۔ اسی قبیل کا ایک اور خاکہ مولوی وحید سلیم کے بارے میں ہے جس کا عنوان "ایک وصیت کی تعمیل" ہے۔ یہ خاکہ اگرچہ مختصر ہے لیکن مولوی وحید الدین سلیم کے روزمرہ کے احوال، انکی عجوبہ شخصیت اور ان کے علم و فضل کا جیسا خوشگوار منظر نامہ اس خاکے میں ملتا ہے۔ وہ اپنے آپ میں، مرزا فرحت کی نگینہ سازی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اب مولوی صاحب یا تو اپنی وضع کردہ اصطلاحات سے جانے جاتے ہیں یا اس بے مثل خاکے کی بدولت۔ شاید اسی لئے یہ قول مشہور ہو گیا ہے کہ فرحت اللہ بیگ اپنا فرحت خام مواد، مردوں سے، پطرس زندوں سے اور رشید احمد صدیقی شعر و ادب سے لیتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں میں دہلی کی ٹکسالی زبان اور روزمرہ و محاورات کا جو لطف ہے۔ وہ ان کے ظریفانہ اسلوب سے ملکر دو آتشہ بن گیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ کے ہم عصروں میں عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور امتیاز علی تاج خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں مزاح نگاروں کے موضوعات اور اسالیب الگ الگ ہیں مگر ہر ایک کی انفرادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی (۱۸۹۵ تا ۱۹۴۱ء) ایک کھلنڈرے، بیباک اور ہنسوڑ تماش بیں کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ انکی کتابیں، خانم،

شریر بیوی، کھرپا بہادر، کولتار اور چچی، عملی مذاق اور نوجوانی کی شوخیوں اور شرارتوں سے لبریز ہیں۔ وہ خالص مزاح نگار ہیں۔ اس لئے ان کی تحریروں میں طنز کے عناصر تقریباً مفقود ہیں۔ البتہ خود ان کا طنزیہ خاکہ، ان کی بہن عصمت چغتائی نے "دوزخی" کے عنوان سے لکھا ہے جو اردو کے چند بہترین خاکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا عظیم بیگ چغتائی کے ظریفانہ سرور کار سے بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔

عظیم بیگ چغتائی کی طرح شوکت تھانوی (۱۹۰۴ تا ۱۹۶۳ء) بھی نوجوانی کی شوخی و شرارت سے بھرپور دلچسپیوں کے مزاح نگار ہیں۔ انشائیوں، ڈراموں اور ناولوں کے علاوہ، انہوں نے پیروڈی، خاکہ نگاری، کالم نگاری اور کیری کچر بنانے میں بھی اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ شوکت تھانوی بہت تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن فطری ذہانت، طبعی مناسبت اور ذاتی محنت سے انہوں نے زبان و بیان پر قابلِ لحاظ قدرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی تحریروں میں زبان اور محاورے کا لطف بہت نمایاں ہے۔

شوکت تھانوی کی شہرت کی ابتدا "سودیشی ریل" سے ہوئی مگر یہ مضمون ایک خاص دور سے متعلق تھا، اور اب اس میں کچھ خاص لطف نہیں ملتا البتہ ان کے کم سے کم تین مضامین، تعزیت، چالیسواں اور اب اس میں کچھ خاص لطف نہیں ملتا اور لکھنؤ کا کانگریس سشن، سدا بہار رہنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان تینوں مضامین میں انسانی فطرت کی مرقع نگاری اور نکتہ رسی کے جو عناصر ہیں، وہ شوکت تھانوی کو طنز و مزاح کے اعلا معیار سے قریب کر دیتے ہیں۔ شوکت تھانوی کی بسیار نویسی نے ان کو کافی نقصان پہنچایا۔ لکھنا ان کے لئے ادبی خدمت ہی نہیں تھی ذریعہ معاش بھی تھا۔ کلیم الدین احمد نے ان کو انڈر گریجویٹ ذہنیت کا مزاح نگار قرار دیا ہے۔ مگر ان کے مزاحیہ کالم 'پہاڑ تلے' کے شذرات، قاضی جی اور منشی جی کے کیری کچر اور بعض دیگر مضامین، یقیناً انڈر گریجویٹ ذہنیت سے آگے کی چیزیں ہیں۔

امتیاز علی تاج، اپنے بے مثل ڈرامے "انار کلی" کی وجہ سے خاصی شہرت کے مالک ہیں مگر ان کا خلق کردہ مزاحیہ کردار "چچا چھکن" اردو کے چند گنے چنے مزاحیہ کرداروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں بیان واقعہ سے کردار نہیں بنتے بلکہ کردار کے مضحک پہلوؤں سے واقعہ کی حیثیت قائم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام چچا چھکن کو جیروم کی مخلوق کا چربہ کہتے ہیں لیکن تاج نے اس کو یہ تمام و کمال اس طرح ہندوستانیت کے رنگ میں ڈبو دیا ہے کہ اب یہ ان کا ایک انوکھا تخلیقی کارنامہ بن گیا ہے۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں شفیق الرحمٰن کا نام بھی شامل ہے جو ذو معنی فقروں اور رعایت لفظی کے سہارے مزاح پیدا کرنے میں کافی مشاق ہیں مگر ان کے مضامین میں فکر و خیال کی رفعت اور نکتہ رسی بہت کم نظر آتی ہے۔ کلیم الدین احمد اور خورشید الاسلام نے اردو طنز و مزاح کے اپنے جائزوں میں شفیق الرحمٰن کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔

اس دور کے ایک اور اہم طنز و مزاح نگار عبدالعزیز فلک پیما (۱۸۷۹ تا ۱۹۵۱ء) ہیں۔ ان کی تحریروں میں فکر و فلسفے کی آمیزش بہت نمایاں ہے۔ وہ صدیوں سے مستحکم چلے آرہے نظریات پر اس طور سے طنز کا وار کرتے ہیں کہ ان نظریات کی ربودگی اور کہنگی از خود منظر عام پر آجاتی ہے۔ بت شکنی کے اس عمل کو وہ مزاح کی چاشنی سے زیادہ موثر اور توانا بنا دیتے ہیں۔ ان کے طنز کی کاٹ اگرچہ گہری ہوتی ہے مگر اس میں خشونت کے بجائے خوش سلیقگی اور تمکنت کے بجائے شگفتگی در آئی ہوتی ہے۔ جماعت کی آستینوں میں چھپے ہوئے بتوں کی نقاب کشائی کو وہ اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتے ہیں۔ مذہب، سیاست، اللہ میاں یا مشینوں کی موت، موضوع کچھ بھی ہو وہ ہر جگہ اپنی بصیرت اور نظر آشنائی سے اس میں ایک نئی جان ڈال دیتے ہیں۔ ادبی تذکروں میں فلک پیما کا نام تو آتا ہے مگر ان کے فکر و فن پر کوئی مبسوط کام اب تک نظر سے نہیں گزرا ہے۔

اس صدی کی پانچویں دہائی، پورے اردو ادب اور اور خاص کر طنز ومزاح کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوئی۔ صرف رشید احمد صدیقی پطرس اور کنہیالال کپور کا مثلث ہی طنز ومزاح کے لئے بہت زیادہ بار آور نہیں ہوا بلکہ اس دہائی کے افسانہ نگاروں اور اور ناول نویسیوں نے بھی طنز ومزاح کے اسالیب سے اپنی تخلیقات کو مزین کیا اور اس میں ایک نئی دل کشی اور توانائی پیدا کی۔ افسانہ نگاروں کے اس گروپ میں پہلا نام تو کرشن چندر ہی کا ہے لیکن سعادت حسن منٹو، غلام عباس، بلونت سنگھ، آغا بابر، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر وغیرہم نے بھی طنز ومزاح کے عناصر سے اپنی تحریروں میں کاٹ پیدا کی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ پانچویں دہائی کا زمانہ زبردست انتشار اور عدم استحکام کا زمانہ تھا جس میں سماجی قدروں کی اتھل پتھل شروع ہو گئی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹تا۱۹۴۵ء) کے دوران اور اس کے بعد کے برسوں میں سیاست اور سماج دونوں میں دروس تبدیلیاں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ آزادی کی جدوجہد اپنے فیصلہ کن دور میں داخل ہو گئی تھی اور گروہی نفاق کی پرتیں کھلنے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم نے اس صورتِ حال کو مزید ابتر بنا دیا تھا۔ یہ ایک ایسا تناؤ بھرا زمانہ تھا جس میں کوئی نقطہ نظر یقین سے پیش کرنا مشکل تھا۔ ترقی پسند تحریک کا اثر بھی اپنا کام کر رہا تھا لیکن اس دور کے تینوں اہم طنز ومزاح نگار اس کے مخالفین میں تھے، موئدین میں نہ تھے۔

احمد شاہ بخاری پطرس (۱۸۹۸تا۱۹۵۸ء) مغربی ادب کے رمز شناس اور طنز ومزاح کے مغربی اسالیب سے پوری طرح بہرہ ور تھے۔ ان کے مضامین میں طنز کی آمیزش کم ہے مگر خالص مزاح کے بہترین نمونے "پطرس کے مضامین" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ "مرید پور کا پیر" میں ایک میاں ہوں، سنیما کا عشق، مرحوم کی یاد میں، ان کے ایسے مضامین ہیں جن میں روزمرّہ کی زندگی سے ابھرنے والے فطری مزاح کی کارفرمائی بہت نمایاں ہے۔ لاہور کا جغرافیہ، ان کے مضامین میں گل سرسَبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مضمون صرف لاہور کی

روپ ریکھا پر نیم مزاحیہ نیم طنزیہ بیان ہی نہیں پیش کرتا بلکہ اہالیان لاہور کی شناخت کا ایک خوبصورت منظر نامہ بھی ہے۔ پطرس نے دیواروں پر لگے اشتہاروں کے تعلق سے کتنی معنی خیز بات کہی ہے:۔

"جہاں بہ حرفِ جلی "محمد علی انقلاب ساز" لکھا ہے، وہ اندقلاب (اخبار) کا دفتر ہے۔ جہاں بجلی پانی بھاپ کا بڑا اسپتال" لکھا ہے، وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی تاج کا مکان ہے۔ کرشنا بیوٹی کریم، شالامار باغ کو اور کھانسی کا مجرّب نسخہ، جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔ "پطرس کے ہمعصر رشید احمد صدیقی کے انشائیے اور خاکے، اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ایک روشن باب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ اپنا خام مواد انسانوں سے کم اور شعر و داب سے زیادہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کا تربیت یافتہ ذہن، فکر و نظر کے نئے گوشے تعمیر کرتا ہے۔ وہ نظریے سے زیادہ اپنی نظر پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کے ذہن پر سرسید اور ان کے رفقائے کار نیز ۱۹۱۵ء کے ایم۔ اے او کالج کی گرفت بہت مضبوط ہے ان کا اصل کارنامہ "مضامین رشید" کے تقریباً دو درجن مضامین ہیں جن میں ارہر کا کھیت، چارپائی، گھاگھ، ماتابدل اور پاسبان، ان کی تخلیقی توانائی اور ذہنی درآگی کی عمدہ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا ایک اور طنزیہ مضمون "کچھ کا کچھ" ہے جس میں ابلیس کے وجود اور اس کے سروکاروں پر فلسفیانہ خیال آرائی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں اقبال کی مشہور نظم "جبریل و ابلیس" سے مل جاتے ہیں۔ "خنداں" ان کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے اور "گنج ہائے گراں مایہ" مشاہیر کے خاکے میں جو ان کی رحلت کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان تینوں کتابوں اور "آشفتہ بیانی میری" کو سامنے رکھ کر ان کے افکار اور طرزِ اظہار کی جو تصویر بنتی ہے۔ وہ مشرقی اقدار کی پاسبانی، عافیت پسندی اور کارزار حیات سے ایک مقررہ فاصلہ قائم رکھنے کی تصویر ہے لیکن ان کے طنزیہ اسلوب کی طرحداری اور ظرافت کی خوش سلیقگی کی وجہ سے ان کی تحریریں قاری کی توجہ اس طرح جذب کر لیتی ہیں کہ ان کی

کمزوریاں بھی خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ مضامین اور خاکوں میں ان کا میں "بہت نمایاں ہے حالانکہ وہ دوسروں کی پاسداری اور دلداری میں بھی اکثر پیچھے نہیں رہتے بشرطیکہ یہ "دوسرا" طبقہ اشرافیہ سے ہو اور علی گڑھ سے متوسل ہو۔ قولِ محال ان کا خاص حربہ ہے اور تشابہ لگنا ان کی پرانی عادت لیکن یہی دو عناصر ان کے طنز و ظرافت کی جان و ایمان ہیں اور بیشتر حالات میں وہ انہی پر تکیہ کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بیسویں صدی کے نصف اوّل کے طنز و مزاح نگاروں میں رشید احمد صدیقی، اپنی بعض کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ، سب سے زیادہ قد آور طنز و مزاح نگار ہیں۔ان کی لمبی عمر کو دیکھتے ہوئے اگر چہ ان کا تخلیقی سرمایہ بہت کم ہے، تاہم جتنا کچھ ہے وہ اردو ادب میں قدر اوّل کی حیثیت رکھتا ہے کرشن چندر کی شہرت اگر چہ بہ حیثیت افسانہ نگار قائم ہوئی لیکن ان کی پہلی مطبوعہ کتاب (۱۹۴۰ء) "ہوائی قلعے "مزاحیہ مضامین پر ہی مشتمل تھی۔ گدھے کی سرگزشت اور گدھے کی واپسی بھی ان کے طنزیہ ناول ہیں جن میں ملک کے سیاسی چک پھیریوں اور نوکرشاہی کے عروج پر ان کا گہرا طنز خاصے کی چیز ہے۔انکے دیگر ناولوں اور افسانوں میں اعلا طنز کے وافر نمونے موجود ہیں۔

کرشن چندر غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے مگر ان کا حشر بھی شوکت تھانوی جیسا ہوا۔ دونوں اپنے زمانے میں شہرت اور مقبولیت کے نقطہ عروج پر متمکن تھے لیکن بعد میں دونوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ وجوہات الگ الگ ہیں لیکن حشر ایک جیسا ہے۔

کرشن چندر کے ہم عصروں میں ابراہیم جلیس اور کنھیا لال کپور، امتیازی حیثیت رکھنے والے طنز و مزاح نگار تھے۔

ابراہیم جلیس کا پہلا کارنامہ "چالیس کروڑ بھکاری" آزادی سے پہلے شائع ہوا تھا۔ دو ملک ایک کہانی آزاد غلام اور پبلک سیفٹی ریزر، آزادی کے بعد کی دین ہیں۔ ابراہیم جلیس اپنا ایک خاص سیاسی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ وہ ہندوستان کی غربت، جہالت، بیماری اور توہم پرستی

کے خلاف ہمیشہ اپنے قلم سے جدو جہد کرتے رہے تاہم ان کے طنز میں تلخی کا عنصر کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ وہ ادبی رچاؤ اور بناؤ کے زیادہ قائل نہیں نظر آتے۔ اس لئے ایک قسم کا کھردراپن، ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت بن گیا ہے۔ کنہیالال کپور (۱۹۱۰ تا ۱۹۸۰ء) کا پورا ادبی سروکار صرف طنز اور مزاح سے ہی رہا ہے، اس لئے ان کو پطرس اور رشید احمد صدیقی کے ساتھ ہی بریکٹ کیا جا سکتا ہے۔ معیار و مقدار کے لحاظ سے بھی ان کی اہمیت ان کے دیگر ہمعصروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ تیشہ و شیشہ، سنگ و خشت، چنگ و رباب، بال و پر اور نوکِ نشتر میں شامل ان کے مضامین زیادہ تر سیاسی اور سماجی بوالعجبیوں اور ہمعصر ادب اور ادیبوں کی انوکھی حرکتوں سے عبارت ہیں۔ "غالبؔ جدید شعراء کی محفل میں" اور "برج بانو" ان کے فکر و فن کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔ ""اردو ادب کا آخری دور" کے عنوان سے کپور نے آبِ حیات کی طرز پر مختلف ادیبوں کے دلچسپ اور پر تفنن خاکے لکھے ہیں جس میں ان کی نکتہ رسی اور ژرف نگاہی بہت نمایاں ہے۔ ایک اقتباس:۔

"ایک ریڈیو مشاعرے میں ایک گستاخ چھوکرے نے آپ کی غزل پر اعتراض کیا کہ آپ کے اشعار بے جان ہیں۔ آپ نے فرمایا "میں شاعر ہوں ابنِ مریم نہیں کہ مردہ اشعار میں روح پھونک سکوں"۔ معترض دم بخود رہ گیا۔"

کنہیالال کپور نے اردو شاعری کی کچھ بہت عمدہ اور دلچسپ پیروڈیاں بھی لکھی ہیں۔ فیض احمد فیض کی نظم تنہائی" کی پیروڈی کو اردو کی بہترین پیروڈیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

فون پھر آیا، دلِ زار، نہیں کوئی نہیں
سائکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا

شوکت تھانوی نے اقبال کی نظم "مومن" کی نہایت معنی خیز پیروڈی لکھی ہے،

کمزور مقابل ہو تو فولاد ہے مومن — انگریز مقابل ہو تو اولاد ہے مومن
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن

پیروڈی لکھنے والے قابل ذکر اصحاب میں سید محمد جعفری ، فرقت کاکوروی، مجید لاہوری، اختر شیرانی، راجہ مہدی علی خاں اور سید ضمیر جعفری شامل ہیں۔ فرقت کاکوروی نے "ناروا" اور "مداوئ" میں ترقی پسند شاعری کی دلچسپ پیروڈیاں پیش کی ہیں مگر کہیں کہیں وہ انتہاپسندی کے بھی شکار ہو گئے ہیں۔

پیروڈیوں کے ساتھ ساتھ اس دور کے مزاح نگار شعراء نے مختلف عصری موضوعات پر دلچسپ مزاحیہ نظمیں لکھی ہیں۔اس ضمن میں سید محمد جعفری کی نظم "کلرک" کو بڑی شہرت ملی۔ شاد عارفی مزاح نگار شاعر نہیں تھے لیکن ان کے کلام میں طنز کی کار فرمائی بہت نمایاں ہے۔ان کی نگاہ، زندگی اور سماج کے سبھی شعبوں پر پڑتی ہے اور ان کے طنز میں نشتر کی کاٹ ہر جگہ موجود ہے۔

بہر حال چوتھی اور پانچویں دہائی میں مزاحیہ شاعری کا منظر نامہ بہت روشن نہیں ہے۔ اس دور کا اصل کارنامہ نثر ہی میں ظاہر ہوا ہے۔ مشاعروں میں پڑھی جانے والی ہزلیہ شاعری کا معیار تو اور بھی نا قابلِ توجہ نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں فکاہیہ کالم نگاری کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے سب سے پہلے اسے "افکار و حوادث" کے عنوان کے تحت الہلال میں پیش کیا۔ ان کا خاص ہدف سر سید کی علی گڑھ تحریک، مسلم لیگ اور انگریزی حکومت تھی۔ خطیبانہ جوش اور عالمانہ طنز ان کے فکاہیہ کالموں کے نمایاں عناصر تھے۔ ان کا طنز کاٹ دار ہونے کے باوجود تعمیری اور اصلاحی تھا اور وہ افراد پر نہیں بلکہ رجحانات اور اداروں پر وار کرتے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خاں نے اپنی سیاسی طنزیہ شاعری سے صحافت کے میدان میں تہلکہ مچادیا تھا۔ ان کے طنز کا وار شدید ہو تا تھا مگر اس میں جذباتیت زیادہ اور تعقّل کم تھا۔ ان کے ہم عصر دیگر فکاہیے کالم نگاروں میں چراغ حسن حسرتؔ، مجید لاہوری، عبد الماجد دریابادی، عبد المجید سالک، نصر اللہ خاں عزیز، شوکت تھانوی کے اسمائے

گرامی بہت روشن ہیں۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو مزاحیہ کالم نگاری نے اس دور میں بہت ترقی کی اور صحافت کو ادب کے درجے تک پہنچادیا اور اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں طنز و مزاح کا ایک معیار قائم ہوا اور ادبی سطح پر اس کو نظم سے کہیں زیادہ نثر میں فروغ حاصل ہوا لیکن ایسا کوئی بسیط، پیچیدہ اور غیر معمولی کارنامہ منظر شہود پر نہیں آیا جس کو ادب کی آبرو قرار دیا جاتا۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جو موضوعات، مزاح نگاروں کی توجہ کا مرکز تھے۔ ان میں سماجی ناہمواریوں اور زندگی کی بوالعجبیوں کے علاوہ، نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش، ہندوستان میں مسٹر اور مولانا کی حد بندی اور سیاسی کرتوتوں کے اشاریے تھے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں جو طوفان بلاخیز اٹھا، اس نے بّرصغیر کے رہنے والوں کو ایک ایسی مشکل اور روح فرسا صورتِ حال سے دوچار کر دیا جس سے ذہن و دل ماؤف ہو گئے ایسے میں انسان کا زندہ اور محفوظ رہنا ہی ایک مشکل عمل بن گیا۔ طنز و مزاح کون لکھتا۔ دس پندرہ سال کا عرصہ گزرنے کے بعد جب تقسیم ہند کی اڑائی ہوئی گرد ذرا تھمی تو اردگرد کا ماحول کچھ صاف نظر آنے لگا اور ادیبوں کو بھی قلم اٹھانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس دور کا خاص واقعہ جدیدیت کی تحریک تھی جو ترقی پسند طرزِ فکر کے ردّ و انکار کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی الگ شناخت بھی قائم کی۔ جدیدیت نے بہر حال طنز و مزاح کو نہیں چھوا اور وہ صرف شاعری، فکشن اور تنقید تک ہی محدود رہی۔

آزادی کے بعد اردو کے نامور مزاح نگار پطرس (م۔۱۹۵۸ء) رشید احمد صدیقی (م۔ ۱۹۷۷ء) ابراہیم جلیس (م۔۱۹۷۶ء) کنھیالال کپور (م۔۱۹۸۱ء) شوکت تھانوی (م۔۱۹۶۳ء) اگرچہ دس بیس سال اور زندہ رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا کام آزادی سے پہلے ہی پورا کر چکے تھے۔ شوکت تھانوی نے آزادی کے بعد بھی لکھا لیکن ان کا فن جس نقطے تک

پہنچ چکا تھا، اسی پر قائم رہا اور ان کی زندگی کی آخری دہائی میں اس میں کچھ نئے ابعاد نہیں پیدا ہوئے۔ ابراہیم جلیس نے آزادی کے بعد طنز نگاری پر زیادہ توجہ صرف کی۔ اوپر شیروانی اندر پریشانی، نیکی کر تھانے میں جا اور واہیات باتیں کے ناموں سے ان کی جو کتابیں منظر عام پر آئیں، ان سے سماج کے تئیں ان کی شدید بے اطمینانی کا اظہار ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اور کنھیالال کپور نے آزادی کے بعد کچھ خاص نہیں لکھا۔ رشید احمد صدیقی اپنے آخری زمانے میں ناصح مشفق بن کر "عزیزانِ علی گڑھ" کو پند و نصائح کا درس دینے لگے تھے جبکہ کپور نے موگا میں پرنسپل ہو جانے کے بعد بہت کم لکھا، حالانکہ وہ بڑی صلاحیتوں کے مزاح نگار تھے۔ ان کی حس مزاح بہت تیز اور نگاہ پردہ دارِ رازِ دوروں تھی۔ انہوں نے فیشن زدہ ادبی رجحانات کے خلاف اعلا درجے کا ادب تخلیق کیا اور برج بانو جیسا شاہکار طنزیہ رقم کیا۔

دوسری طرف ۶۰ء کی دہائی میں ابھرنے والے دو فنکاروں یعنی مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خاں نے اپنی بیحد شگفتہ اور توانا تحریروں سے طنز و مزاح کے ایوان کو اس طرح منور کر دیا کہ لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ مشتاق احمد یوسفی کے کھٹے میٹھے مضامین کا پہلا مجموعہ "چراغ تلے" ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا اور طنز و مزاح کے شائقین نے خوشگوار حیرت اور مسرت سے اس کا استقبال کیا۔ ان کی ابتدائی تحریروں سے ہی اردو کے . سومیاتی اسالیب سے ہٹ کر چیزے دگر کا احساس ہوتا ہے، حالانکہ ان کی ابتدائی تحریروں پر کہیں کہیں ان کے دو پیشروؤں، پطرس اور رشید احمد صدیقی کا بہت ہلکا سا پرتو نظر آ جاتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی بہت جلد خود اعتمادی کی اس منزل پر پہنچنے میں کامیاب رہے، جہاں ان کا انفرادی اسلوب اس حد تک روشن ہوا کہ اردو کے معتبر ترین نقادوں نے اس عہد کو یوسفی کا عہد قرار دیا اور کہا کہ یوسفی کی رسائی اردو ادب کی معراج تک ہوئی ہے ان کی تحریروں میں صرف بصیرت، خود آگہی اور قدر شناسی ہی نہیں ہے بلکہ اسلوب کی ندرت، الفاظ کی رمز شناسی اور عبارت کی دراکی بھی درجہ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔

چراغ تلے اور خاکم بدہن، ان کے مضامین کے مجموعے ہیں جبکہ زرگزشت ان کے بینکنگ کیریئر کے حالات پر مشتمل سوانح ہے۔ آبِ گم میں خاکہ، سوانح، کیری کیچر کا ملا جلا انداز ہے لیکن اندرونی طور سے یہ ایک مربوط سوانحی ناول ہے جس کا موضوع نوسٹلجیا اور اس کے اثرات ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی اردو کے اسالیب اور الفاظ و تراکیب کے ایسے مزاح داں اور زبان کے تخلیقی استعمال پر ایسی بے پناہ قدرت رکھنے والے فنکار ہیں کہ اردو ادب کی پوری تاریخ میں اس کی مثال خال خال ہی ملے گی۔ ان کا خاص انداز جو صرف انہی سے مختص ہے اردو کے معروف الفاظ و تراکیب میں ذرا سی تحریف کر کے اس میں ایک نئے اور مضحکہ خیز معنی پیدا کرنا ہے۔ ان کی کتاب کا نام زرگزشت "معروف ترکیب سرگزشت کی تحریف ہے۔ اسی طرح انہوں نے سرچشمہ کے بجائے "شرچشمہ "راندہ درگاہ کے بجائے راندہ زرگاہ" آپ بیتی کے بجائے "پاپ بیتی" جیسی تراکیب وضع کر کے ایک نیا جہانِ معنی آباد کیا ہے۔ ایک مثال:۔

یوسفی کے دوست صبغے (کتب فروش) بولے "چھوڑو بھی! فانی مصور غم ہیں تو مہدی مصورِ بنت عم۔ واللہ! وہ انشائیہ نہیں "نسائیہ" لکھتے ہیں۔ بالآخر میں نے ایک جانے پہچانے پروفیسر نقاد کا نام لیا، مگر پتہ چلا کہ انہوں نے اپنے کانوں سے فاضل پروفیسر کے والد بزرگوار کو لکھنؤ کو "نکھلؤ" بولتے سنا تھا اور مزاح شریف کو "مجاز شریف کہتے سنا تھا۔ چنانچہ اس پدرانہ نااہلی کی بنا پر، ان کے تنقید مضامین دکان میں کبھی بار نہ پا سکے۔"

(خاکم بدہن۔ صفحہ ۱۸)

مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تحریروں کو اور زیادہ معنی خیز بنانے کے لئے دو عدد فرضی کردار، مرزا ودود بیگ اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس گھڑ لئے ہیں اور جو بات وہ اپنی جانب سے نہیں کہنا چاہتے۔ اس کو ان کرداروں کی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف کلام کی بلاغت بڑھ جاتی ہے بلکہ لطف و انبساط کا ایک نیا چشمہ از خود وجود میں آجاتا ہے۔

یوسفی کے ہمعصر کرنل محمد خاں (۱۹۲۰ تا ۱۹۹۹ء) نے صرف ایک کتاب بجنگ آمد، لکھ کر ہی اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی تاریخ میں بقائے دوام کا پٹہ لکھوالیا۔ بظاہر یہ کتاب ان کے فوجی کیریئر کی سوانحی داستان ہے لیکن اس کے اندر جو ماجرا آفرینی اور اسلوب کی طرآری وطرحداری ہے، وہ ان کو اپنے طرز کا منفرد مزاح نگار بنادیتی ہے۔ سیّد ضمیر جعفری نے محمد خاں کی شخصیت اور انشاء پردازی کا سراغ لگانے کی جو کوشش کی ہے، وہ کچھ اس طرح ہے۔

"ان کی ذات میں دو الگ الگ لیکن اپنی جگہ بھرپور شخصیتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہی ہل اور تلوار والا (کسان رسپاہی) محمد خاں! کم سخن، کم آمیز نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ، کھیت میں جٹ جائے تو چٹانوں سے جوئے شیر کھینچ لائے، تلوار اٹھالے تو نہنگوں کے نشیمن تہ و بالا کردے۔ دوسرا محمد خاں، ادیب اور انشاپرداز محمد خاں ہے۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، چمن مشرب، بہار ایجاد، خوش دل و گرم اختلاط سادہ ؤ روشن جبیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں محمد خاں، ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے، تائید کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو کمک پہنچاتے ہیں۔" (مقدمہ حنائے سرناخن) بجنگ آمد کے بعد محمد خاں نے ایک مزاحیہ سفرنامہ "بہ سلامت روی" اور ایک مجموعہ مضامین "بزم آرائیاں" پیش کیا مگر اس کے بعد انہوں نے سبکدوشی کا اعلان کردیا۔ محمد خاں ایک منفرد اسلوب کے طرحدار مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں سے مزاح کے شرارے اس طرح پھوٹتے ہیں جیسے رنگ و نور کی بارش ہو رہی ہو۔ ان کے مزاح میں ایک صحت مند انسان کی خلقی شگفتگی اور ایک بھری پری دنیا کے فطری حسن کا احساس ملتا ہے۔ زبان و اسلوب پر ان کی قدرت قابلِ رشک ہے۔ ان کی عبارت میں نہ صرف اردو کے اشعار اور مصرعے بلاغت کا حسن دوبالا کرتے ہیں بلکہ وہ پنجابی زبان کی کہاوتوں اور معنی خیز فقروں سے بھی اپنی عبارت کو سجاتے ہیں۔ شوخیٔ تحریر کی یہ مثال دیکھئے۔

"ادھر سے رنگارنگ گاؤں میں ملبوس چارپانچ نوجوان طالبات کی ایک ٹولی ہماری طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ اس ٹولی پر ہماری نگاہ پڑی تو ایک سرخ پوش ساحرہ پر اٹک گئی کیونکہ وہی اس سنسنی خیز خبر کی شاہ سرخی تھی اور دور ہی سے مطالعے پر مجبور کر رہی تھی۔ ظالم کے سینے پر گاؤن کا یہ عالم تھا جیسے دو چوبہ شامیانہ تنا ہو۔ قریب آکر رکی اور گفتگو کا آخری حصہ سننے کے بعد ہم سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے معلوم ہے تم کیا ہو۔ تم پامسٹ ہو۔"

اب ہم دست شناس تو نہ تھے لیکن تھوڑے سے میم شناس ضرور تھے اور جب دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت تحریر کے زیر مطالعہ آنے کا امکان ہے تو اقبال کر لیا اور کہا "ینگ لیڈی! میں پیشہ ور پامسٹ تو نہیں ہوں لیکن گاہے گاہے ازراہ شوق، اس سے انکار بھی نہیں۔" (بسلامت روی۔ صفحہ ۲۴۵)

محمد خاں کا مزاح ڈرائنگ روم کا مزاح ہے یا پھر یاران خوش اطوار کے درمیان چہکنے بہکنے کا مزاح ہے۔ اس میں نہ تو مشقت کے پسینے کی خوشبو ہے، نہ عام آدمی کے دکھوں کے درمیان سے ابھرتا اور گاتا گنگناتا مزاح۔ یہ ایک فوجی کرنل کی خوش مذاقی اور زندہ دلی سے عبارت ہے اور یہی اس کا ستارہ امتیاز ہے۔

مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خاں سے پہلے، ابن انشا کا ذکر لازم آتا ہے جن کا فقیرانہ اسٹائل اور مومنانہ مزاح اپنے اندر بہت کچھ زندہ و تابندہ وسائل رکھتا ہے۔ چلتے ہو تو چین کو چلئے، آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے، 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں، ابن انشا کے وہ دلچسپ مزاحیہ سفرنامے ہیں جو اپنے قارئین سے بھرپور خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ابن انشا کو لمبو کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

"اس بر عظیم میں جوں جوں مشرق اور جنوب کی طرف بڑھتے جایئے، لوگوں کی بدحالی اور نکبت بڑھتی جاتی ہے۔ دو دو چار چار آنے بھی مل جائیں تو ناشتے کا سامان ہو جاتا ہے۔ چونکہ ابھی گاڑی کے پلیٹ فارم پر آنے میں وقت تھا، لہذا ایک بینچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے

لگے۔ تھوڑی دیر میں یوں لگا جیسے ابر چھا گیا ہو۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ تین آدمی بینچ کے پیچھے کھڑے ہمارے اخبار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور تین آدمی سامنے اکڑوں بیٹھے دوسرا صفحہ دیکھ رہے ہیں۔ جہاں جہاں کوئی مسافر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا، اسی طرح شہد کا چھتہ بنا ہوا تھا۔" (ابن بطوطہ کے تعاقب میں۔ ص ۱۷۶) ابن انشاء ایک خوش فکر اور نرم رو شاعر بھی تھے (کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا)۔ ان مزاح پاروں میں بھی وہی شبنمی لطافت موجود ہے جو ان کی شاعری میں تھی۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔

ابن انشا کی طرح فکر تونسوی (م۔ ۱۹۸۷ء) بھی شاعر تھے لیکن آزادی کے بعد وہ شاعری سے تائب ہو چکے تھے اور طنز و ظرافت کو اپنی جولاں گاہ بنالیا تھا۔ اسی سے ان کی فطری صلاحتیں برگ و بار لائیں اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔

فکر کو عوامی مقبولیت ان کے اخباری کالم "پیاز کے چھلکے" سے ملی جو اردو کے روزانہ اخبار "ملاپ" میں سالہاسال تک متواتر چھپتا رہا۔ اپنے کالم میں وہ روزمرہ کے سماجی و سیاسی مسائل پر تلخ و ترش تبصرے کرتے تھے اور اخبار کے قارئین کی اکثریت ان کی باتوں کو اپنے دل کی آواز سمجھتی تھی۔ ان کے ان کالموں کے دو مجموعے "چھلکے چھلکے" اور "پیاز کے چھلکے" کے ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ بقول مزاح نگار دلیپ سنگھ :۔

"اس نے اخبار کے کالموں کو ادبی شان عطا کی اور سیاسی طنز کو بامِ عروج تک پہنچا دیا"۔ فکر کے کالموں میں مزاح کی چاشنی کم اور تلخ کافی زیادہ ہوتی تھی تاہم اس کا ایک خاص معیار تھا اور اس نے اپنے اس معیار کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ اشتراکی نظریات سے فکر کی وابستگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن طبقاتی کشمکش کو بھی فکر نے ذہنی سطح پر محسوس کیا اور ادبی سطح پر اس کا اظہار کیا۔ یہ فکر کی ایسی خوبی ہے جس کی مثالیں کمیاب ہیں۔"

فکر نے اخباری کالموں کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی سولہ کتابیں، ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھیں جن میں ناول، خاکہ، ڈرامہ آپ بیتی، سبھی شامل ہیں۔ فکر کی ایک

خوبی یہ بھی ہے کہ وہ زندگی بھر (کم از کم ۴۰ سال) بے تکان لکھتے رہے لیکن ان کے قلم پر کبھی اضمحلال طاری نہیں ہوا اور وہ سدا بہار ہی رہا۔ ان کی زندگی کے آخری سال کی تحریر بھی اتنی ہی جاندار اور توانا ہے جتنی ان کی گزشتہ تحریریں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کے تجربات میں جیسے جیسے گہرائی آتی گئی، ان کے اسلوب اور طرز ادا میں بھی نکھار آتا گیا۔

فکر تونسوی کوئی بہت بڑے عالم فاضل، مفکر اور دانشور نہیں تھے لیکن متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگیوں کو انہوں نے جس انہاک سے پڑھا تھا اور جس طرح اس کو صفحۂ قرطاس پر عکس ریز کیا تھا، اس سے ان کی دانش مندی، باریک بینی اور صلابتِ فکر کا احساس ہوتا ہے۔ "بیویوں کی ٹریڈ۔ یونین، نامی ہڑتال کے آئینے میں دیکھنے اور دکھانے کی جو کوشش کی ہے، اس کا ایک نمونہ یوں ہے:۔

"ویکلی چھٹی منظور کی جاتی ہے مگر اس شرط پر کہ تم اس دن بال بچوں کو ہمراہ لیکر میکے چلی جایا کرو"۔ میکے کے ذکر پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ ہر عورت کی کمزوری ہے۔ میکے کے سامنے سارا ٹریڈ۔ یونین ازم منتشر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے یا مطالبے کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔

مطالبے کے ساتھ شرط کی پخ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کر لئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور میں بھی بیگم کی غیر حاضری میں خاوند کو جو آزادی نصیب ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہیں۔ بیگم نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ اس فیصلے پر صاد کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار۔ انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور 'مات"

دوسری مثال:۔

ایک دن سردار ملکھا سنگھ نے آکر مجھ سے کہا "فکر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے؟

میں نے عرض کیا حضور میری معلومات تو آپ سے بھی زیادہ ناقص ہیں۔

اسے میری بات پر شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوا کیونکہ بد قسمتی سے وہ میرے خلوصِ نیت پر یقین رکھتا تھا اور اعتقاد نے ہمیشہ خودی کی کئی عمارتیں ڈھائی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے ہمیں گمراہ کر دیا تھا ورنہ عمارت ڈھے جانے پر خدا نے بندے سے کبھی نہیں پوچھا کہ "بتا تیری رضا کیا ہے!" کیا کوئی دوسری عمارت تعمیر کرنی ہے؟" (اور مجھے ایوارڈ ملا")

بلاشبہ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد کے سرگرم مزاح نگاروں میں فکر تونسوی کا نام سرفہرست ہے مگر مزاحیہ کالم نگاری کے دوسرے سرے پر ڈاکٹر مشفق خواجہ کا نام بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ فرق یہ ہے کہ فکر تونسوی سیاسی اور سماجی کالم نگار تھے جبکہ مشفق خواجہ کے طنز کا نشانہ اردو کی ادبی کتابیں اور اردو کے شاعر و ادیب ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں صرف کتاب، مصنف اور کتاب کے مندرجات کو ہی عموماً اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اردو زبان کے اسالیب پر ان کے بے مثل قدرت اور اردو کے الفاظ و تراکیب کی معنویت سے ان کی گہری شناسائی، ان کے طنز میں تلخی کے باوجود ایک خوشگوار لطافت پیدا کر دیتی ہے۔ وہ جس کتاب پر اپنا زورِ قلم آزماتے ہیں، اکثر اس کا تیاپانچہ کر دیتے ہیں مگر اس ہنرمندی کے ساتھ کہ جو ان کے طنز کا شکار ہوتا ہے وہ بھی زیرِ لب مسکرا دیتا ہے اور دوسرا جو شخص پڑھتا ہے وہ بھی اپنے ظرف و ضمیر کے مطابق لطف اندوز ہوتا ہے۔

کالم نگاری میں مشفق خواجہ ایک نئی طرز کے موجد ہیں جس کو "ہجو ملیح" کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اپنے لاموں کی بنت میں وہ ایک ماہر کاریگر کی طرح ادبی اسالیب کے تمام اوزاروں سے کام لیتے ہیں اور پڑھنے والے کو دم بخود کر دیتے ہیں۔ بعض نقادوں نے ان کے تبصروں کو معاندانہ، جارحانہ، جابرانہ، اور سفاکانہ بھی کہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ لوگ ان سے فرمائشیں کر کے اپنے کتابوں پر تبصرے لکھواتے ہیں اور ان کے آرٹ کی داد دیتے ہیں۔ ان کے کالموں کے بارے میں مجتبیٰ حسین کی رائے زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے۔

"خامہ بگوش نے اپنے گہرے طنز کے ذریعے ادب کے بڑے لوگوں کو ان کا چھوٹا پن دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کا کالم جارحانہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن عالمانہ اور عارفانہ بھی ہوتا ہے۔" (کتاب نما دہلی۔ جولائی ۹۵ء)

مشفق خواجہ "خامہ بگوش" کے قلمی نام سے کالم لکھتے رہے ہیں لیکن مئی ۱۹۹۷ء سے انہوں نے کالم نگاری کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا ہے۔ ان کے اس فیصلے سے اردو ادب میں طنز و مزاح کا جو نقصانِ عظیم ہوا ہے، اس کو مشفق خواجہ نہیں بلکہ ان کے قاری بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ ادبی کالموں کا ایک عمدہ انتخاب "خامہ بگوش کے قلم سے" (جلد اوّل) مظفر علی سید نے مرتب اور مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی دوسری جلد بھی جلد ہی شائع ہونے کی خوشخبری دی گئی ہے۔

"لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر رہے شاعری" سے ایک اقتباس:۔

"ساقی سے پوچھا گیا کہ ان کی بعض نظموں میں فحاشی کیوں ملتی ہے۔ ساقی نے جواب دیا کہ فحاشی تو میر، سودا، نظیر اور آتش کے یہاں بھی ملتی ہے۔ سوال کرنے والے کو چاہیے تھا کہ وہ یہ بھی پوچھتا کہ بڑے شاعروں کے یہاں بڑی شاعری بھی ملتی ہے۔ اگر تقلید کرنا تھا تو آپ بھی ویسی ہی بڑی شاعری کرتے مگر آپ نے ان کی بڑی شاعری ہی کی تقلید کیوں کی؟ اچھا ہی ہوا کہ ساقی سے یہ سوال نہیں کیا گیا ورنہ وہ بڑی شاعری ہی کو بڑی شاعری ثابت کر دیتے۔" (کتاب نما۔ نومبر ۹۷ء)

احمد ندیم قاسمی کے مشہور ادبی جریدے "فنون" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"فنون" ایک بلند پایہ ادبی رسالہ ہے جس میں ایسے شاعروں کا کلام کثرت سے شائع ہوتا ہے جو اپنا کلام بھیجتے وقت خریداری نمبر کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ (اردو صحافت میں طنز و مزاح از ڈاکٹر ظفر عالم ظفری ص۔ ۲۸۵) فکاہیہ کالم نگاری میں ابراہیم جلیس، محمد خالد اختر، عطاالحق قاسمی، طاہر مسعود، انتظار حسین سر فہرست ہیں، جن کے الگ الگ فکری زاویے اور

اسالیب ہیں مگر ان میں جو قدر مشترک ہے وہ طنز و مزاح کو ادبی سطح پر برتنے اور اس کے گوناں گوں نئے امکانات آزمانے سے ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۲ء میں روزنامہ سیاست حیدر آباد میں مزاحیہ کالم نگاری لکھنے سے کیا تھا مگر اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور آج ان کا شمار عہد حاضر کے سر خیل مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اب تک ان کے مزاحیہ خاکوں کے تین مجموعے، دو مزاحیہ سفر نامے اور مزاحیہ مضامین کی سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ماہنامہ شگوفہ حیدر آباد نے ان کی شخصیت اور فن پر ایک خاص نمبر ۱۹۸۷ء میں شائع کیا تھا جس میں ملک کے ممتاز نقادوں کے مضامین شامل ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے زندگی اور اس کے مظاہر کو ایک متوسط طبقے کے آدمی کے زاویہ سے دیکھا اور برتا ہے۔ اس لیے ان کے مضامین میں زندگی کے تلخ و ترش و شیریں سبھی ذائقے موجود ہیں۔ ان کے مزاح میں طنز کی ہلکی سی تلخی ضرور ہوتی ہے مگر اس کے پیچھے انسان دوستی اور دردمندی کی ایک زیریں لہر ہمیشہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ ان کا مزاح انسانی صورتِ حال کی نہ صرف خلاقانہ مصوری کرتا ہے بلکہ خرابیوں کو بدلنے کی زیریں خواہش کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین، دراصل اس روایت کے امانتدار ہیں جو پطرس اور رشید احمد صدیقی سے ہوتی ہوئی ان تک پہنچتی ہے اور جس میں کنہیالال کپور اور فکر تونسوی کے اثرات بھی شامل ہیں۔ البتہ خود اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس سے کوئی مماثلت ان کی تحریروں میں نظر نہیں آتی۔ مجتبیٰ حسین کی نئی کتاب "آخر کار" (مطبوعہ ۱۹۹۷ء) سے ایک اقتباس:۔

پچھلے دنوں ایک مشاعرے میں ایک شاعرہ آئیں تو اس یونیفارم میں نہیں تھیں جسے پہن کر وہ عموماً مشاعروں میں آیا کرتی تھیں۔ اس لباس کی خوبی یہ ہوتی ہیکہ اسے نہ پہننے میں دیر لگتی ہے اور نہ اتارنے میں۔ یہ لباس اتنا مختصر ہوتا تھا کہ اس میں سے ان کے شعروں کے

سارے پوشیدہ معانی و مطالب تک نظر آجاتے تھے۔اب کے مشاعرے میں آئیں تو سر پلو سے ڈھکا ہوا تھا۔ سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے بجائے انہوں نے اپنی نظریں بیاض پر مرکوز رکھیں۔کلام بھی اس ڈھنگ سے پڑھا" جیسے یہ ان کا اپنا کلام ہو"۔ کلام پڑھنے کے بعد وہ بالکل پیچھے جا کر یوں بیٹھ گئیں جیسے کہنا چاہتی ہوں کہ ہم بہو بیٹیاں کیا جانیں کہ مشاعرہ کیا ہوتا ہے۔یہ سب آپ کے کالم کا نتیجہ ہے"(مشجرہ۔ صفحہ ۱۱۲)

مجتبیٰ حسین کی طرح احمد جمال پاشا (م۔ ۱۹۸۷ء) بھی سماجی حالات کو برائیوں اور بوالعجبیوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے ہاں مزاح کے ساتھ طنز کی کاٹ کچھ زیادہ نظر آتی ہے۔انہوں نے اردو دنیا کے تصنع اور کاروباری ذہنیت کو خاص طور سے تختۂ مشق بنایا ہے۔"ادب میں مارشل لاء"ان کا وہ معرکتہ الآرا مضمون ہے جس نے ان کی شہرت کو عروج پر پہنچادیا۔یہ مضمون دراصل مارشل لا کی پیروڈی ہے جس کو انہوں نے ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں پر بڑی چابکدستی سے منطبق کیا ہے۔اس میں ادب کے نقلی کاروبار پر گہرا طنز ہے اور ادب و تنقید کے ان تمام احوال و آثار کی خاصی گرفت کی گئی ہے جن سے شعر و ادب کی سبکساری ہوتی ہے۔

احمد جمال پاشا کا دوسرا شاہکار "پکوتہ ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" ہے جس میں رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، عبادت بریلوی اور قاضی عبدالودود کے اسالیب کی بڑی خوبصورت اور جاندار پیروڈیاں ملتی ہیں۔ان کے چند اور مضامین بہت اعلیٰ پائے کے ہیں لیکن ان کے یہاں پست و بلند کا تناسب غیر متوازن ہے۔ کہنا چاہیے کہ انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہیں کیا۔ان کی عمر نے بھی زیادہ دیر تک وفا نہیں کی ورنہ ممکن تھا کہ وہ کچھ اور اعلا درجے کے کارنامے انجام دینے میں کامیاب ہوتے۔

طنز و مزاح کے باب میں زندہ دلانِ حیدر آباد کے کارنامے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کا ماہوار رسالہ شگوفہ، ہندو پاک کا شاید واحد ادبی رسالہ ہے جو صرف طنز

ومزاح کے لئے مختص ہے۔ حیدر آباد کی سرزمین سے ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے علاوہ ،یوسف ناظم، بھارت چند کھنہ ،نریندر لوتھر، خواجہ عبد الغفور (مرحوم) پرویز ید اللہ مہدی اور مسیح انجم جیسے مزاح نگاروں نے اپنی شگفتہ تحریروں سے قارئین کو نہ صرف مسحور کیا ہے بلکہ ان کو کچھ سوچنے پر بھی مجبور کیا ہے۔

یوسف ناظم ہمارے سینیر مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ مضامین اور خاکے ہی نہیں لکھے بلکہ اپنے تبصروں اور تنقیدی تحریروں میں بھی مزاح کا رنگ بھرنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ ان کے مزاح میں طنز کی تلخی کم ہوتی ہے لیکن موقعے موقعے سے وہ طنز کا استعمال بڑی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ انکے تحریر کردہ خاکوں میں باقر مہدی کا خاکہ بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے، اس کا ایک اقتباس آپ بھی دیکھئے:۔

"باقر مہدی کے متعلق دورائیں میں نے کبھی نہیں سنیں۔ پورا ہندوستان، یعنی غیر منقسم ہندوستان، اس بات پر متفق ہے کہ باقر مہدی جتنے عالم ہیں، اس سے زیادہ ظالم ہیں۔ ان کی بیباکی اور سفاکی میں ذرا سا ہی فرق ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں خوف کی جو ہلکی سی لہر دوڑتی رہتی ہے، اس لہر کا نام باقر مہدی ہے۔" (شگوفہ۔ جون ۸۵ ء صفحہ ۳۳۰)

یوسف ناظم کثیر التحریر مزاح نگار ہیں جس کی وجہ سے ان کے بہت سے مضامین سوچ سوچ کر لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ وہ بریکٹ کے اندر فقرے لکھنے کے بڑے شائق ہیں جس کی وجہ سے عبارت کی روانی ہی میں فرق نہیں آتا ہے بلکہ ذہن کو جھٹکا بھی لگتا ہے۔

خواجہ عبد الغفور مرحوم لطیفہ گو مزاح نگار تھے۔ احمد جمال پاشا نے بھی شروع میں لطیفوں کا سہارا لیا تھا در اصل لطیفہ گوئی اور ماجرا نگاری، طنز و مزاح کے بالکل ابتدائی اوزار ہیں۔ جو ادیب صرف انہی پر قانع ہو گیا، اس کا فن ایک ہی جگہ منجمد ہو جاتا ہے۔ مزاح صرف چٹکلے بازی نہیں ہے۔ یہ زیادہ بسیط پیچیدہ اور دوررس ادبی سروکار کا مطالبہ کرتا ہے

اور قطرے میں دریا کے مدو جزر کو دیکھنے اور دکھانے کا متقاضی ہوتا ہے لیکن اردو والوں کی روایتی سہل نگاری اس کے آڑے آجاتی ہے اور کوئی بڑا کارنامہ وقوع پذیر نہیں ہو پاتا۔ پھر بھی یہ بات کچھ کم قابلِ اطمینان نہیں کہ بقول شمس الرحمٰن فاروقی "اردو کا طنزیہ و مزاحیہ ادب، دنیا کے بہترین طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے معیار کا ہے۔ ہندوستان کی کسی زبان میں اس مرتبے کا طنزیہ مزاحیہ ادب موجود نہیں ہے۔"

(شگوفہ۔جون ۸۵ء صفحہ ۳۴۰)

یہ کرشمہ اردو زبان کا ہے کہ اس کے عناصر ترکیبی کچھ اس طور سے واقع ہوئے ہیں کہ زبان پر تھوڑی سی قدرت اور کھلی آنکھ سے دنیا کو دیکھنے اور دکھانے کی صلاحیت، بہترین مزاح پاروں کو جنم دینے کا باعث بن جاتی ہے۔

ادبی حلقوں میں اب یہ خیال راسخ ہوتا جارہا ہے کہ ہندوستان میں طنز و مزاح کا قافلۂ نوبہار، مجتبیٰ حسین تک پہنچ کر جیسے رک سا گیا ہے۔ بعد کی صفوں میں اگر چہ کئی مزاح نگار موقعے موقعے سے اپنی چھب دکھاتے ہیں لیکن کوئی ایسا مزاح نگار اب تک سامنے نہیں آیا جس سے مستقبل کی امیدیں اعتماد کے ساتھ وابستہ کی جاسکیں۔

پرویز ید اللہ مہدی اور شفیقہ فرحت کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ فیاض ابن فیضی، رشید قریشی، مسیح انجم، شکیل اعجاز، شیخ رحمان اکولوی، رؤف خوشتر، اظہر مسعود رضوی، اقبال انصاری، جاوید وشسٹ، بانو سرتاج، اعجاز علی ارشد، علیم اختر، فضل حسنین، علی عمران اور چند دوسرے مزاح نگاروں کے ایک آدھ مضامین کبھی کبھی کسی رسالے میں نظر آجاتے ہیں لیکن اس سے ان کی ادبی صلاحیتوں کے بارے میں کوئی بات وثوق سے کہنا مشکل ہے۔ نئی نسل کے مزاح نگاروں میں نصرت ظہیر کا تیسرا مجموعہ "بقلم خود" ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ وہ پیشے سے صحافی ہیں تاہم ان کے قلم میں بیباکی اور خیال میں حیرت خیز طرآری ہے۔ ان کے مضامین میں مصلحت کوشی اور زمانہ سازی پر خاصہ گہرا طنز موجود ہے، اس لئے ان کی

اپیل بھی ہمہ گیر ہے۔ وجاہت علی سندیلوی (م۔۱۹۹۷ء) کی تحریروں میں شگفتگی اور خوش مزاجی کی کیفیت ضرور ملتی ہے لیکن فکروخیال کی دبیز تہوں سے ان کا مزاح تقریباً خالی ہے۔ وہ دراصل شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کے سلسلے کے مزاح نگار ہیں اور مزاح ان کا مستقل ادبی سروکار بھی نہیں ہے۔

پچھلی دو دہائیوں میں جس مزاح نگار نے اردو والوں کو متوجہ کیا وہ دلیپ سنگھ (م۔۱۹۹۶ء) تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اردو میں ان کی مزاح نگاری کی عمر دس بارہ برس سے زیادہ نہ تھی لیکن اسی مختصر عرصے میں انہوں نے اپنے فن کو منوالیا۔ ان کے مزاحیہ مضامین کی دو کتابیں، ایک ناول اور ایک سفر نامہ شائع ہوا ہے لیکن اسی قلیل سرمائے سے وہ اردو کے ایک اہم مزاح نگار بن گئے۔ ان کے مزاح میں پنجاب کی خوش طبعی اور خلقی شگفتگی کے ساتھ ساتھ روزمرہ کے مسائل کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور دکھانے کا رجحان بہت نمایاں ہے۔ دلیپ سنگھ بڑی سادگی سے اکثر بڑی گہری باتیں کہہ جاتے ہیں۔

آزادی کے بعد کی نصف صدی میں جہاں طنز و مزاح کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ افسانوں، ناولوں، یہاں تک کہ تنقیدوں اور تبصروں میں اس کا عمل دخل شروع ہو گیا اور نثری اسلوب کو چمکانے میں اس سے کام لیا گیا، وہیں مزاحیہ شاعری کے ضمن میں چند ہی نام ایسے ملتے ہیں جن سے مزاحیہ شاعری کی آبرو قائم ہے مثلاً راجہ مہدی علی خاں، سید محمد جعفری، دلاور فگار، رضا نقوی واہی، سید ضمیر جعفری، رئیس امروہوی اور کسی حد تک ماچس لکھنوی، شوق بہرائچی اور احمق پھپھوندوی۔ مشاعروں میں پسند کئے جانے والے مزاح نگار شاعر مثلاً آفتاب لکھنوی، ناظر خیالی، ہلال سیوہاروی، استاد رامپوری۔ ناظم سلطانپوری مرحوم، عادل لکھنوی وغیرہ مشاعروں کے سامعین کے ذوق و ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر ہزلیں لکھتے ہیں، اس لئے ان کی شاعری میں نہ کوئی گہرائی ملتی ہے اور نہ لطفِ بیان ہوتا ہے، بس چٹخارے دار باتوں اور چٹکلوں سے وہ سامعین کو خوش کر لیتے ہیں۔

رضا نقوی واہی کی مزاحیہ نظموں کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔اور واقعہ یہ ہے کہ ان کو مزاحیہ شاعری میں بڑا کمال حاصل ہے۔ان کی تنقیدی نگاہ سماج کے ہر طبقے اور ادارے پر پڑتی ہے اور وہ ان سب کی خرابیوں اور ناہمواریوں کو لے کر مزاح کے نت نئے گوشے نکال لیتے ہیں۔انکے خیالات واضح اور انداز بیان سلجھا ہوا ہوتا ہے لیکن اس میں مزاح اور اس کے پیچھے چھپے ہوئے طنز کا پہلو قاری کو تبسم زیر لب پر مجبور کر دیتا ہے۔واہی سماجی طنز کے ماہر نشتر کار ہیں اور اس میدان میں مشکل سے کوئی ان کا حریف ہو گا۔واہی کی ایک نظم ''محقق'' کا یہ بند دیکھئے:۔

یہ جو اک حضرت چلے آتے ہیں قبرستان سے	یہ نہ سمجھیں، آپ ہیں بیزار اپنی جان سے
آپ کو قبروں سے الفت، عشق ویرانے سے ہے	آپ گھبراتے ہیں جیتے جاگتے انسان سے
کوئی کتنا ہی بڑا ہو فلسفی ، شاعر، ادیب	عمر بھر اس سے رہا کرتے ہیں آپ انجان سے
ہاں مگر جیسے ہی پا جاتا ہے بیچارہ وفات	آپ اس کو چاہنے لگتے ہیں جی سے جان سے
سونگھتے ہیں دیر تک مرحوم کی خاکِ لحد	پھر یہ فرماتے ہیں اٹھ کر عالمانہ شان سے
طول و عرض قبر سے یہ صاف چلتا ہے پتہ	گور کن آئے تھے اطرافِ بلوچستان سے

سید محمد جعفری کا کلام ''شوخیٔ تحریر'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔نمونہ کلام یہ ہے
ساگودانہ ،مونگ کی کھچڑی، غذا ہو جائے گی۔ محو حیرت ہوں کی دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی''

ان کی ایک بہت مشہور نظم ''کلرک'' آج بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہو گی۔اس کا ایک بند اس طرح ہے:۔

خلد بریں کو ناز تھا اپنے مکین پر	اور یہ بھی مر مٹا تھا کسی حورِ عین پر
لالچ کی مہر، کندہ تھی دل کے نگیں پر	ٹی۔اے وصول کرنے کو اترا زمین پر

ابلیس راستے میں ملا کچھ سکھا دیا
اتر فلک سے تھرڈ میں انٹر لکھا دیا

نذیر شیخ نے علامہ اقبال کو نظم نیا شوالہ کی پیروڈی میں، کالج ہاسٹل کے باورچی خانے کے انتظام پر جو تیکھا طنز کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے:۔

سچ کہہ دوں اے منیجر ، گر تو برا نہ مانے
تیرے کچن کے برتن سب ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو کہاں سے سیکھا
جو گھاس پھوس لاکر ہم کو لگا کھلانے
تنگ آ کے میں نے آخر تیرے کچن کو چھوڑا
تیری یہ دال چھوڑی، چھوڑے تمام کھانے

دلاور فگار (م جنوری ۹۸ء) کی نظم "شاعر اعظم" بہتوں کے ذہن میں اگر پوری نہیں تو جزوی طور سے ضرور محفوظ ہو گی۔ان کے کلام میں واقعاتی مزاح کی بڑی پر لطف مثالیں ملتی ہیں۔اردو کے شعر و ادب سے مواد لے کر وہ اس کو مزاح میں اس طرح بدل دیتے ہیں کہ لبوں پر مسکراہٹیں از خود بیدار ہو جاتی ہیں۔ کراچی ر بمبئی ر دلی یا کسی بڑے شہر کی بسوں کا یہ دلچسپ منظر ان کے نادر آرٹ کی ایک عمدہ مثال ہے:۔

بس میں لٹک رہا تھا کوئی ہار کی طرح — کوئی پڑا تھا سایۂ دیوار کی طرح
سہما ہوا تھا کوئی گنہ گار کی طرح — کوئی پھنسا تھا مرغِ گرفتار کی طرح

محروم ہو گیا تھا کوئی ایک پاؤں سے
جوتا بدل گیا تھا ، کسی کا کھڑاؤں سے

سید ضمیر جعفری اور دلاور فگار میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ضمیر نے بیشتر انسانی حماقتوں اور اجتماعی کمزوریوں کو نشانۂ مشق بنایا ہے۔اس لئے ان کی اپیل ہمہ گیر ہے۔ان کا طنز بے ضرر اور ان کا مزاح مسرت آمیز ہے۔ فیض کی مشہور غزل ۔ رنگ پیراہن کا خوشبو زلف بکھرانے کا نام۔ پر ان کی پیروڈی دیکھئے:۔

کس زمانے میں وفا کی بات، یارانے کا نام　　　　آنکھ پر گوگو چڑھی ہے، ہاتھ دستانے کا نام
شاعری، بجتی ہوئی آواز میں گانے کا نام　　　　لیڈری، نوعُمر بچوں سے گالیاں کھانے کا ناٹ

فتنہ پردازی تو اونچی کمیٹیوں والے کریں
شہر میں بدنام، ماجھے اور سلطانے کا نام

قابلِ تشویش امر یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مزاحیہ شاعری کا فسانہ تقریباً بند ہو چلا ہے۔ اب کوئی اعلا پیانے کا مزاحیہ شاعر (بہ استثناء رضا نقوی واہی) ہمارے بساطِ سخن پر موجود ہی نہیں ہے۔ مشاعروں کے شاعر صرف میاں بیوی سالی سرجج کے رشتوں اور کچھ کھلے ڈھکے جنسی اشاروں سے کام چلا لیتے ہیں۔ سماج میں جو ناہمواریاں ہیں، چھوت چھات، ذات پات، مذہب و ملک کے جو مناقش ہیں سیاسی انار کی بھرشٹاچار کی، جرائم کی کثرت، ذہنی افلاس، اخلاقی گراوٹ، کثرتِ آبادی، مفلسی، بیروزگاری، ادب کی تجارت زدگی، اردو کی زبوں حالی، اہلِ اقتدار کی نااہلی، سماجی اقدار کا بدلاؤ اور اسی قسم کے دیگر موضوعات و مسائل کے انبار ہیں۔ ہم عصر مزاحیہ شاعر اور نثر نگار ان کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں یا پھر اس خام مواد کو فن میں بدلنے کا ہنر نہیں جانتے۔ یہ ہنر واقعتاً شاد عارفی مرحوم کو آتا تھا مگر ان کے لہجے کی تلخی کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی۔ موجودہ وقتوں میں طنز کو سنجیدہ شعروں میں برتنے کی طرح، مظفر حنفی نے ڈالی ہے اور اس کو انہوں نے کمال ہنر مندی سے برتا ہے۔ ان کے طنز میں برہمی اور بیزاری کے بجائے ایک قسم کی نرم روشائستگی ملتی ہے جس کی وجہ سے ان کا طنز مثبت اثرات کا حامل بن جاتا ہے۔

سرشار کے خوجی، امتیاز علی تاج کے چچا چھکن اور شوکت تھانوی کے قاضی جی کی طرح موجود نصف صدی میں کوئی مستقل مزاحیہ کردار، بھی نہیں پیدا ہو سکا ہے۔ مشفق خواجہ لاغر مراد آبادی اور مشتاق احمد یوسفی نے مرزا ودود بیگ کے خیالی کردار ضرور وضع کیے

ہیں مگر یہ اپنے خالق کے صرف تابع مہمل ہیں اور ان کا اپنا کوئی مستقل خارجی وجود نہیں ہے۔اس بھری پری دنیا میں جہاں زندگی کی پیچیدگی بہت بڑھ گئی ہے، مستقل مزاحیہ کردار کی تخلیق کوئی بہت مشکل امر نہیں ہے لیکن نہ معلوم کیوں ہمارے مزاح نگاروں نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی،البتہ جاسوسی ناولوں کے مصنف ابنِ صفی نے عمران اور قاسم کے سدابہار کردار پیدا کئے جنہوں نے پڑھنے والوں کے دل موہ لئے۔اردو کے معیاری مزاحیہ ادب میں ایسا ایک بھی کردار آج تک نہیں بن سکا۔

طنزومزاح،اس صدی کی پہلی نصف صدی میں بھی لکھا گیا اور خوب لکھا گیا۔دوسری نصف صدی میں بھی اس کا سرمایہ کسی طرح کم عیار نہیں مگر اس کے مستقبل پر جو سوالیہ نشان لگا ہوا ہے،وہ کب اور کس طرح مٹے گا ،اس کا جواب ہنوز پردۂ خفا میں ہے۔

اقدار

سہ ماہی کتابی سلسلہ

جلد اول : شمارہ اول

جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء

قیمت فی پرچہ : 35روپے

ڈی لکس ایڈیشن : 60روپے

سالانہ : 100روپے

کمپوزنگ : عفیف ڈزائننگ گروپ

ناشر : رائٹرس گلڈ (انڈیا) لمیٹڈ

۲۲، غالب اپارٹمنٹس، پیتم پورا۔ دہلی۔ ۳۴

مطبع : ایچ۔ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

سرپرست : سید شمیم کاظم

مدیر : علی جاوید

تقسیم کار

• موڈرن پبلشنگ ہاؤس

گولا مارکیٹ۔ دریاگنج، نئی دہلی

• ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

۲۶۵۲/۵۵ کوچہ چیلان، دریاگنج نئی دہلی

فون : ۳۲۴ ۳۵۴۴

خط و کتابت کا پتہ : ۲۲، غالب اپارٹمنٹس، پیتم پورا۔ دہلی۔ ۳۴

فون : 701 2125

AQDAAR

URDU QUARTERLY

January-March 2001

Delux Edition:

Editor: Ali Javed

22, Ghalib Apts. Pitampura, Delhi-110034

Ph: 701 2125

اقدار
اردو سہ ماہی
نذر علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081